# تاشقند کا جوہری



اعداد:
محمد طاہر نقاش

2

کتاب وسنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ



# تاشقند کا جوہری

اعداد: ............................... محمد طاہر نقاش

پہلا ایڈیشن ........................ فروری 2010

پاکستان میں ہماری کتب مندرجہ ذیل اداروں سے مل سکتی ہیں

- لاہور: دار الاندلس 37230549 - دار السلام شوروم 37232400 - مکتبہ قدوسیہ 37230585 - مکتبہ سلفیہ 37237184 - کتاب سرائے 37320318 -
اسلامی اکیڈمی 37357587 - نعمانی کتب خانہ 37321865 - مکتبہ علمیہ 37224228 - مکتبہ دار الہدیٰ 37639567 - البلاغ 35717842 -
- راولپنڈی: [illegible] 5530188 - اسلام آباد: مسعود اسلامک بکس 2201356 - البلاغ 2201420 - دار السلام شوروم 0321-5370378 -
- کراچی: فضلی سنز 32213601 - مکتبہ بیت القرآن 021-32211998 - علمی کتب خانہ اردو بازار [illegible] -
- فیصل آباد: مکتبہ اسلامیہ بیرون امین پور بازار 631204 - مکتبہ اہلحدیث امین پور بازار 041-2626282, 0300-6628021
- پشاور: معراج کتب خانہ 214720 - حیدرآباد: مکتبہ [illegible] 0333-2607204
- سیالکوٹ: مکتبہ صحابہ ناصر روڈ سیالکوٹ 052-4591911

دار الابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

رحمٰن مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون: 0300-4453358, 042-7361428

تاشقند
کا
جوہری
دارالابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا ہی مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔
المکتبۃ الرحمانیہ
۹۹۔ جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
نمبر ..................
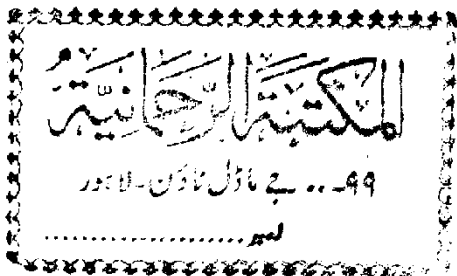
# فہرست

سچی بات

# آپ بھی اپنے دوستوں کو تحفہ دیں

پیارے بچو!...... سناؤ کیسے ہو، کیسے دن گزر رہے ہیں!!؟ امید ہے آپ کو ہماری بچوں کے متعلق تمام کتابیں پسند آئی ہوں گی اور یقیناً یہ کتاب ''تاشقند کا جوہری'' بھی پسند آئے گی۔ بعض لوگوں نے ہماری کتاب ''جادوگر کا شاگرد'' اور ''بغداد کا تاجر'' کو بہت پسند کیا اور خود پڑھنے کے بعد دوسروں کو پڑھنے کے لیے بطور تحفہ دیا، تاکہ وہ بھی اپنے عقیدہ کی اصلاح کر کے توحید کی محبت کا چراغ اپنے دل و دماغ میں روشن کریں۔ بعض لوگوں نے کافی تعداد میں ان کتابوں کو خرید کر ننھے بچوں میں بطور گفٹ تقسیم کیا۔

آپ اپنی آراء اور مفید تجاویز سے ہمیں بروقت آگاہ کرتے رہیں، ہم آپ کی خدمت میں مفید سے مفید دلچسپ تاریخی اسلامی سچی کہانیاں پیش کرتے رہیں گے، ان شاء اللہ۔ مفید، سبق آموز، عبرت ناک اور نیک کاموں پر ابھارنے والی یہ کہانیاں آپ بوڑھا ہونے تک یاد رکھیں گے۔ بلکہ دوسرے لوگوں خاص طور پر مستقبل کے بچوں کو بھی سناتے رہیں گے۔ اس کے بعد ہم مزید مفید دلچسپ، تاریخی کہانیاں آپ کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں، بس ذرا انتظار اور صبر کریں۔

آپ کا بھائی

خادم کتاب وسنت

محمد طاہر نقاش

# دیانت داری کا بدلہ

کسی شہر میں ایک ''خالد'' نامی غریب کباڑیار ہتا تھا۔ جو بہت ایمان دار تھا' کیونکہ وہ لوگوں سے چیزوں کے زیادہ دام نہ لیتا تھا، دوسرے کباڑیے ایک روپے کی چیز دوروپے میں بیچا کرتے تھے مگر وہ اتنا زیادہ منافع لینا گناہ سمجھتا تھا اور آٹھ روپے کی چیز نو روپے سے زیادہ کی کبھی نہ فروخت کرتا تھا۔ پہلے پہلے تو وہ اس کاروبار سے بڑے مزے میں رہا' اس کا اور اس کے گھر کا گزارہ ہوتا رہا مگر آخر ایک دن ایسا بھی آگیا جب اس کے ہاتھ میں پیسہ نہ رہا اور وہ روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہو گیا۔ وہ سارا سارا دن دوکان پر بیٹھا رہتا مگر نہ کوئی خریدار آتا اور نہ اس کی کوئی چیز فروخت ہوتی، مالک دوکان اس سے کرائے کا تقاضا کرتے کرتے الگ تنگ آگیا،آخر تھک ہار کر ایک دن تو اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر بیس تاریخ تک تم نے دوکان کا کرایہ ادا نہ کیا تو پھر تمہیں دوکان فوراً خالی کرنا پڑے گی۔ یہ سن کر تو خالد بہت گھبرایا اور اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

پھر گاہکوں کا انتظار کرتے کرتے اٹھارہ تاریخ ہو گئی' مگر خالد کے پاس کرایہ جمع نہ ہوا' وہ بہت پریشان تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ آخر اٹھارہ تاریخ کی شام کو ایک امیر آدمی اس کی دوکان پر آیا اور بہت دیر تک اس کی چیزیں دیکھتا رہا مگر اسے کوئی چیز پسند نہ آئی' جب وہ واپس جانے لگا تو یکایک اس کی نگاہ الماری کے اوپر ایک طرف باقی چیزوں سے الگ تھلگ رکھی ہوئی ایک صندوقچی پر پڑی' وہ جاتے جاتے رک گیا' جمن سے بولا: وہ صندوقچی مجھے دکھاؤ۔

جمن نے صندوقچی اتار کر اس کے ہاتھ میں دے دی اور ساتھ ہی وہ بولا: آپ اسے دیکھ لیجیے مگر میں اسے بیچ نہیں سکتا۔ امیر آدمی نے صندوقچی کو بغور دیکھا تو اسے بے حد پسند آئی کیونکہ یہ صندوقچی نہ لکڑی کی تھی نہ لوہے کی بلکہ کسی عجیب وغریب دھات سے بڑی خوبصورتی سے بنائی گئی تھی۔ اس کے اندر پیندے میں کسی دیوتا کی تصویر بنی ہوئی تھی' جس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے ،اس نے خالد سے کہا: بولو' اس کی کیا قیمت لو گے؟

خالد نے جواب دیا: ''میں اسے بالکل نہیں بیچ سکتا جناب''

امیر آدمی نے کہا:

معلوم ہوتا ہے اس طریقہ سے تم اس کی قیمت بڑھانا چاہتے ہو اچھا

بولو کیا دوں؟

مگر خالد نے جواب دیا: نہیں جناب! میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں اسے کسی قیمت پر نہیں بیچ سکتا؟

اچھا تو پچیس روپے لو گے امیر نے اصرار کیا۔

نہیں جناب!

اچھا پچاس!

نہیں محترم! پچاس تو کیا میں پانچ سو میں بھی نہیں دوں گا۔ امیر آدمی نے ذرا رک کر کہا اچھا میں ایک سو روپیہ دینے کے لیے تیار ہوں، اس سے زیادہ ایک روپیہ بھی نہیں!

خالد نے پھر بھی انکار میں سر ہلا دیا' حالانکہ خالد کے لیے اس وقت ایک ایک روپیہ سو کے برابر تھا اور اگر وہ سو روپے لے لیتا تو اس کی مصیبت کے دن کٹ جاتے' مگر اس نے امیر کو صاف جواب دیتے ہوئے کہا: "بات دراصل یہ ہے جناب! کہ یہ صندوقچی میری نہیں بلکہ کسی دوسرے کی امانت ہے، پھر بھلا میں اسے کیوں کر بیچ سکتا ہوں؟"

امیر آدمی نے جاتے ہوئے کہا: اچھا ممکن ہے کہ تم کل تک صلاح مشورے کے بعد بیچنے پر راضی ہو جاؤ، اس لیے میں کل پھر آؤں گا، اس عرصے میں جو کچھ سوچنا ہے تم سوچ لینا۔ یہ کہہ کر امیر دکان سے اترا اور

گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا' رات کو خالد گھر پہنچا تو اپنی بیوی سے بولا: تمہیں یاد ہوگا کہ پانچ چھ سال ہوئے ہمارے پڑوس میں ایک لڑکی رہتی تھی جس کا نام ''نعیمہ'' تھا اور جب اس غریب کی ماں اچانک مرگئی تھی تو ہم نے اسے ہمدردی سے کے طور پر کئی ہفتے اپنے پاس رکھا تھا؟

خالد کی بیوی نے جواب دیا: ہاں، ہاں! مجھے یہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ خالد نے کہا: ''اور تم یہ بھی نہ بھولی ہوگی کہ کچھ عرصہ کے بعد جب وہ یہاں سے اپنی خالہ کے ساتھ چلی گئی تھی تو جاتے وقت وہ اپنی صندوقچی ہمارے پاس بطور امانت چھوڑ گئی تھی' جو ابھی تک میری دکان میں محفوظ پڑی ہے۔ آج ایک امیر گاہک بڑی مہنگی قیمت پر خریدنے کے لیے تیار تھا مگر میں اسے کس طرح بیچ سکتا تھا۔

کیا دیتا تھا؟ بیوی نے بے صبری سے پوچھا!

ایک سو روپیہ' خالد نے جواب دیا۔

تم نے بڑی غلطی کی' بیوی نے لالچ میں آکر کہا: آج اگر تم اسے بیچ دیتے تو ہمارے وارے نیارے ہو جاتے' ہم تو پیسہ پیسہ کے محتاج ہیں، اس لیے ہم سے اتنی ایمان داری کس طرح نبھ سکتی ہے، اتنے عرصے بعد اس لڑکی کو بھلا کیا یاد رہا ہوگا اور یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہ اس وقت زندہ بھی ہے یا چکی ہے؟

خالد نے جواب دیا: مگر جو چیز ہماری نہیں ہے اسے بیچنے کا ہمیں کیا حق حاصل ہے؟ نہ بابا مجھ سے تو یہ امانت میں خیانت کبھی نہ ہو سکے گی۔

لیکن اتنے ہی ایمان دار بنے رہو گے تو پرسوں دکان کے کرائے کا کیا بنے گا؟ بیوی نے طنز سے کہا۔ جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔خالد نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا' ایمان داری نہ چھوڑوں گا مگر بدنامی مول لے لوں گا۔

بے ایمانی کی لعنت سے بدنامی ہزار درجے اچھی ہے۔ خالد نے جواب دیا: میاں بیوی یہی باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں دروازے پر کسی نے دستک دی' خالد نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک برقع پوش عورت چہرے سے نقاب اٹھائے اندر داخل ہوئی' خالد نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ عورت وہی نوجوان لڑکی ''نعیمہ'' تھی جو کبھی ان کے پڑوس میں رہتی تھی۔ تھوڑی دیر تک آرام سے بیٹھنے کے بعد اس نے کہا: چچا جان! آپ کے پاس میری امانت ایک صندوقچی پڑی ہوگی' مجھے اس کی بہت ضرورت ہے؟

خالد نے یہ سنتے ہی مکان سے ملحقہ دکان جا کر کھولی اور وہ صندوقچی لا کر نعیمہ کے ہاتھ میں دے دی۔ نعیمہ نے اسے کھول کر پیندے پر ہاتھ رکھا پھر خالد سے کہا ذرا چراغ تو لانا چچا جان!

خالد چراغ لایا تو اس نے پیندے میں بنی ہوئی تصویر کے سر پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا پیندا ایک دم اوپر اٹھ آیا اور اس کے اندر سے ایک کاغذ

کا پرزہ نکلا نعیمہ نے غور سے پڑھا تو اس پر لکھا تھا کہ ہمارے مکان میں درخت کے نیچے ایک برتن دبا ہوا ہے اس میں کئی ہزار روپے کا زیور ہے جب بھی تمہیں روپوں کی ضرورت پڑے تو زیور نکال لینا۔

یہ نعیمہ کی ماں کے ہاتھ کی تحریر تھی جس میں اسے وصیت کی گئی تھی ۔نعیمہ نے اسی وقت خالد کو ساتھ لیا اور اپنے مکان کا دروازہ کھولا پھر درخت کے نیچے سے زمین کھودی گئی تو وہاں سے زیورات کا بھرا ہوا برتن نکل آیا!

اس کی خوش قسمتی میں اب کیا شبہ تھا وہ غریب بہت مسرور تھی' اس موقع پر جو اسی دن اس کا امیر آدمی سے معاملہ ہوا تھا خالد نے اسے سارا واقعہ سنایا (کہ کس طرح آج ہی ایک امیر آدمی اسے صندوقچی کا ایک سو روپیہ دے رہا تھا' لیکن اس نے دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔)

نعیمہ کو خالد کی ایمان داری پر بہت خوشی ہوئی اور کہنے لگی: ''چچا جان اگر آپ یہ صندوقچی فروخت کر دیتے تو میں لٹ جاتی کیونکہ مجھے کل ہی میری خالہ نے بتایا تھا کہ تمہارے پاس جو صندوقچی تھی اس کے پیندے میں تمہاری والدہ نے تمہارے لیے کاغذ کا ایک رقعہ مرتے وقت رکھا تھا میرا خیال ہے اس میں تمہارے لیے کوئی خاص بات لکھی ہو گی اور عجب نہیں کہ اپنی ماں کی ہدایت پر عمل کرنے سے تمہیں کوئی خاص فائدہ پہنچے وہ بتانے لگی

کہ خالہ کی یہ بات سن کر میں فوراً یہاں چلی آئی اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ اگر ایسے ایمان دار نہ ہوتے تو مجھے یہ زیور کبھی نہ ملتا، اس لیے اب آپ کو اس میں سے آدھا حصہ لینا ہوگا جو کہ میں اپنی خوشی سے آپ کو دیتی ہوں۔

ایمان دار خالد نے بہت انکار کیا مگر نعیمہ کسی طرح نہ مانی تب خالد کو نصف زیور لینا ہی پڑا دوسرے دن جب اس نے یہ زیور بیچا تو اسے ایک ہزار روپے وصول ہوئے' لیکن اگر وہ لالچ میں آ کر دیانت داری کو ہاتھ سے چھوڑ دیتا تو اسے صرف ایک سو روپیہ ملتا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ لالچ بری بلا ہے۔

# دو عجیب و غریب بہنیں

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک گھر میں کوئی عورت اپنی دو لڑکیوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ بڑی لڑکی کا نام ''نازو'' اور چھوٹی کا نام ''نرگس'' تھا۔ تھیں تو یہ دونوں سگی بہنیں مگر ان کی عادتوں میں بڑا فرق تھا۔ نازو بڑی کام چور ،سست اور گستاخ تھی مگر اس کے مقابلے میں نرگس بڑی فرماں بردار، محنتی اور نیک دل لڑکی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بزرگوں کی ہر بات مان لیتی تھی اور اپنی بڑی بہن کی طرح انہیں ٹکا سا جواب نہیں دیتی تھی۔ جب کبھی ماں نازو سے کہتی کہ نازو بیٹی! نرگس نے آگ جلائی ہے تو ذرا اتنے میں برتن دھو دے تو وہ جواب دیتی: ہائے اللہ! میں کیا کروں! صبح سے کام کرتے کرتے تھک کر چور ہو گئی ہوں' ذرا نرگس سے ہی کہو نا کہ وہ برتن دھو لے۔

اس پر ماں کہتی: بیٹی تو بھی کتنا جھوٹ بولنے لگی ہے، صبح سے کوئی کام تو تو نے کیا ہی نہیں، نرگس بیچاری نے ہی سب کچھ کیا ہے۔ تو یہ بات سن

کر ناز و چیخ کر کہتی: اچھا! میں نے کچھ بھی نہیں کیا تو اب بھی کچھ نہیں کروں گی، اپنی لاڈلی سے ہی کہو وہی سب کام کر لے گی۔ نرگس کو چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے جھگڑا کھڑا کرنا بہت برا معلوم ہوتا تھا، اس لیے وہ چپ چاپ برتن خود ہی دھو دیتی تھی۔

اس طرح دن گزرتے چلے جا رہے تھے، ایک دن کا ذکر ہے کہ ان کے گھر میں پانی کی ایک بوند بھی نہ تھی اور گرمی کا یہ عالم تھا کہ بار بار پیاس لگ رہی تھی' اس دن ان کی ماں کی طبیعت ذرا خراب تھی، اس لیے ماں کا سارا کام بھی نرگس نے ہی کیا تھا۔

وہ بیچاری تھک چکی تھی، ابھی کام سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھی کہ ماں نے پکارا نرگس بیٹی !ذرا مجھے پانی تو پلانا' لیکن پانی تو گھر میں تھا ہی نہیں، اس لیے وہ گڑھا اٹھا کر اس کنویں پر پہنچ گئی جہاں سے گاؤں کے سارے لوگ پانی بھرا کرتے تھے۔پانی سے گڑھا بھر کر وہ اٹھانے ہی والی تھی کہ ایک بڑھیا اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور بولی: بیٹی! میں بڑی دور سے آئی ہوں ذرا مجھے تھوڑا سا پانی تو پلا دو!

نرگس بولی: بہت اچھا بڑی ماں! میں بھاگ کر اپنے گھر سے گلاس لے آؤں' تب تک آپ میرا انتظار کریں میں ابھی واپس آتی ہوں۔

یہ کہہ کر نرگس بھاگی بھاگی گھر آئی اور گلاس لے کر کنویں پر پہنچی

بڑے ادب سے بڑھیا کو پانی پیش کیا' بڑھیا نے پانی پی کر اس نیک سیرت لڑکی کو دعائیں دی اور بولی بیٹی تو بہت اچھی ہے میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ جب تو بات کرے تو تیرے منہ سے پھول گریں۔اتنی بات کہہ کر بڑھیا وہاں سے چل دی نرگس پانی کا گھڑا لے کر گھر پہنچی تو ماں نے پوچھا :نرگس بیٹی !پانی لے آئی ہے کیا؟

نرگس نے جواب دیا: جی ہاں اماں جان !اور جب اس نے یہ الفاظ کہے تو اس کے منہ سے کئی خوبصورت پھول گرے۔ ماں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئی اور اس پر نرگس نے ساری بات سنا دی۔ ماں یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوئی مگر نازو کا تو مارے حسد سے برا حال ہو گیا اور اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر نرگس بات کرتے وقت منہ سے پھول گرا سکتی ہے تو میں کیوں نہیں گرا سکتی' کل صبح میں بھی کنویں پر جاؤں گی اور بڑھیا کو تلاش کر کے پانی پلا دوں گی۔

دوسرے دن وہ گھڑا لے کر کنویں پر پہنچ گئی' اتفاق کی بات ہے کہ وہ بڑھیا پھر ادھر سے گزری اور اس نے نازو سے بھی اس طرح کہا بیٹی مجھے سخت پیاس لگی ہے ذرا پانی تو پلا دو!

نازو نے کسی کا کہا ماننا تو سیکھا ہی نہیں تھا' غصے سے کہنے لگی میں آخر تمہیں پانی پلاؤں تو کیسے؟ گلاس تو تیرے پاس ہے نہیں؟ بڑھیا سمجھاتے

ہوئے بولی: بیٹی! تیری بہن تو گھر سے گلاس لے آئی تھی تو بھی ذرا لے آ
میں چند منٹ تک انتظار کر لیتی ہوں!

نازو کو بڑھیا کی یہ نصیحت بہت بری لگی اور کہنے لگی تیری نوکر تو نہیں ہوں، اری بڑھیا! جو بھاگی بھاگی گھر جاؤں اور تیرے لیے گلاس لاؤں' چل بھاگ یہاں سے!

بڑھیا کو نازو کے گستاخانہ الفاظ سن کر بڑا رنج ہوا اور وہ غصے میں آ کر بد دعا دیتے ہوئے بولی: ''اچھا لڑکی میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں التجا کرتی ہوں کہ وہ تجھے ایسا بنا دے کہ جب تو بات کرے تو تیرے منہ سے بچھو گریں''۔

یہ کہہ کر بڑھیا چلی گئی۔ اب نازو کی سنو!

وہ گھر پہنچی جب بات کرنے لگی تو اس کے منہ سے بچھو گر پڑے وہ سخت پریشان ہوئی اور زار و قطار رونے لگی' مگر اب رونے سے کیا ہو سکتا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہ کسی سے بات بھی نہ کرتی تھی کہ کہیں منہ سے بچھو نہ گر پڑیں اور نہ ہی کسی کے سامنے جاتی تھی تا کہ بات نہ کرنی پڑ جائے۔ نرگس جیسی ہمدرد بہن بھلا اس کی یہ حالت کیسے دیکھ سکتی تھی۔ چند ہی روز کے بعد وہ نازو کو ساتھ لے کر کنویں پر بڑھیا کی تلاش میں نکلی تا کہ ان سے منت و سماجت کر کے نازو کے لیے دعا کروائی جائے بڑھیا کے مل جانے پر نرگس

نے عاجزانہ درخواست کی۔

"اماں جان! مہربانی کر کے آپ میری بہن کے حق میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کیجیے کہ وہ اپنے کرم سے اس کی یہ مصیبت دور کر دے میں تمام عمر آپ کی احسان مند رہوں گی۔تب بڑھیا نے نازو سے وعدہ لیا کہ وہ آئندہ کبھی بھی کسی کے ساتھ گستاخی سے پیش نہیں آئے گی یہ کہہ کر بڑھیا نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے دعا کی اے اللہ کریم! اس نادان بچی کو اپنی رحمت سے معاف فرما دے"یوں وہ روزانہ کئی دن تک اللہ کریم کے حضور اس گستاخ بچی کے حق میں دعا مانگتی رہی۔ اللہ کریم نے اسے معاف کر دیا اور اس کے منہ سے بچھو گرنے بند ہو گئے۔اب نازو کے منہ سے اپنی بہن کی طرح منہ سے پھول تو نہیں گرتے ہیں مگر اس کی باتوں میں مٹھاس اور نرمی ضرور ہوتی ہے اس کے بعد نازو اپنی بہن نرگس کی طرح ایک فرماں بردار لڑکی بن گئی۔

......☆......☆......☆......

# سخی حاتم

حاتم عرب کے طائی قبیلے کا سردار تھا اور لوگوں میں اپنی سخاوت کی وجہ سے مشہور تھا۔ جب بھی کسی کو کوئی ضرورت پیش آتی وہ حاتم سے آ کر کہتا اور جیسے تیسے ہوتا حاتم اس کی ضرورت پوری کر دیتا بعض اوقات ایسا ہوتا کہ حاتم لوگوں کو اپنے کپڑے تک دے دیتا تھا جبکہ خود تنگی برداشت کرتا تھا اس بات پر اس کی بیوی اکثر اس سے جھگڑا کرتی تھی۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حاتم کے پڑوس میں کسی کی شادی تھی اور حاتم کی بیوی نے اس شادی میں جانے کے لیے ریشمی چادر خریدی تھی، اس چادر کو اس نے بڑی حفاظت سے رکھا ہوا تھا،ایک روز حاتم کے پاس ایک بڑھیا روتی ہوئی آئی اور بولی: اے حاتم !میں بہت غریب ہوں اور میری لڑکی جوان ہے' اس کے پاس کوئی ایسا کپڑا بھی نہیں کہ وہ اپنا جسم چھپا سکے ،اس لیے تو مجھے ایک چادر دے دے۔ یہ سن کر حاتم کا دل بھر آیا اس نے بوڑھی عورت کو بڑی عزت سے بٹھایا خوب کھلایا پلایا ،پھر اپنی بیوی سے آ کر

وہی چادر مانگی۔ حاتم کی بیوی نے پہلے تو اپنی یہ چادر دینے سے انکار کیا مگر جب حاتم کسی طرح بھی نہ مانا تو مجبوراً اس نے وہ چادر دے دی، مگر اپنے دل میں یہ عہد کیا کہ اب آئندہ اس مرد کے ساتھ نہ رہوں گی، دراصل وہ حاتم کی اس عادت سے بہت تنگ آ چکی تھی کیونکہ وہ جب بھی کوئی چیز بناتی یا کچھ پکاتی تھی تو حاتم اسے لوگوں میں بانٹ دیتا تھا۔ حاتم کی بیوی اب اس کے مکان سے دور ایک الگ خیمے میں رہنے لگی تھی اور اس نے غصے کی وجہ سے حاتم کے پاس آنا جانا بند کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اب اسے روزانہ کے خرچ اور کھانے پینے کی تکلیف تھی، اس لیے اس نے قبیلے کے ایک دوسرے سردار سے شادی کر لی جو بہت امیر تھا۔

ایک روز اتفاق سے حاتم کہیں باہر گیا ہوا تھا رات کا وقت تھا جبکہ وہ مال دار سردار اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے باغ میں بیٹھا ہوا تھا اور حاتم کی سابق بیوی گھر کے اندر کچھ سی رہی تھی کہ چند مسافر اسے حاتم کا گھر سمجھ کر گھر پر آئے اور انہوں نے کھانے کا سوال کیا۔ حاتم کی بیوی نے اپنے دل میں سوچا کہ گھر میں بہت کچھ ہے، کیوں نہ ان لوگوں کو کھانا وغیرہ کھلا دیا جائے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے اپنی نوکرانی کو آواز دی اور کہا کہ باہر جا کر سردار سے کہہ دو کہ کچھ مہمان آئے ہیں انہیں کھانا وغیرہ بھیج دو۔ نوکرانی نے جب جا کر یہ کہا تو سردار کو بہت غصہ آیا اور اس نے ڈانٹ

پلاتے ہوئے جواب دیا: بیگم سے کہہ دو کہ میں حاتم نہیں ہوں جو ہر آئے گئے کو کھانا کھلاؤں' اگر ایسے ہی خیرات کرتا تو آج اتنا امیر نہ بن سکتا۔

حاتم کی بیوی نے جب مال دار شخص کا یہ پیغام سنا تو وہ بہت پریشان ہوئی اور نوکرانی سے بولی: ''اچھا اب تو حاتم کے پاس جا اور اس سے مہمانوں کے لیے کھانا مانگ کر لا، ورنہ ہماری ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔''

نوکرانی یہ حکم پاکر دوڑی حاتم کے گھر گئی جو تھوڑی ہی دور ایک خیمے میں رہتا تھا۔ نوکرانی نے اسے مہمانوں کی آمد کا تمام ماجرا کہہ سنایا اور پھر بیگم کا پیغام دے کر ان کے لیے کھانا طلب کیا۔ حاتم یہ تمام واقعہ سن کر بے حد پریشان ہوا کیونکہ اس کے پاس تو اس وقت ایک دانہ بھی نہ تھا۔ حاتم خود کئی روز سے فاقے کاٹ رہا تھا۔ ایسی حالت میں سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ جواب دے دیا جائے اور وہ انکار کرنے ہی والا تھا کہ اچانک اسے اپنے اونٹ کا خیال آگیا۔

حاتم جلدی سے اٹھا اور جھٹ پٹ اپنی سواری کا اونٹ ذبح کر ڈالا، پھر اس کے گوشت کو بھونا اور کباب بھون کر نوکرانی کے حوالے کر دیئے دوسری طرف جب رات کافی بیت گئی اور نوکرانی نہ لوٹی تو حاتم کی بیوی نا امید ہوگئی، مہمانوں کے سامنے اپنی بے عزتی کا خیال اسے بہت پریشان کر

رہا تھا۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اتنے میں نوکرانی آ گئی اور اس نے حاتم کی سواری کا اونٹ ذبح کر کے مہمانوں کے لیے کھانا تیار کر کے دینے کا حال کہہ سنایا' پھر یہ کھانا مہمانوں کو پیش کر دیا گیا۔

جب مہمان کھانا کھا کر رخصت ہوئے تو حاتم کی سابقہ بیوی حاتم کے پاس گئی اور اس کے پاؤں پر گر کر روتے ہوئے بولی: اے نیک دل حاتم! مجھے معاف کر دے اب میں سخاوت کو کبھی برا نہیں سمجھوں گی' میں نے جان لیا ہے کہ سخی آدمی ہی دراصل سب سے اچھا ہوتا ہے اور آئندہ مرتے دم تک تمہارے ساتھ مل کر لوگوں کی مدد کرتی رہوں گی۔

......☆......☆......☆......

# قبر کی یاد

ہائے اللہ! یہ کیا ہو گیا اب میں باہر کیسے نکلوں گی۔ باتھ روم میں ہاتھ دھونے کے بعد جب باہر نکلنے ہی والی تھی تو میری نظر دروازے والی دیوار پر چمٹی ہوئی ''محترمہ چھپکلی'' پر پڑی۔ یا اللہ! میری مدد کر، اگر تو چاہے تو یہ یہاں سے ہٹ جائے گی ورنہ نہیں۔اے اللہ! تو میری مدد فرما۔ اس سے قبل کہ میرا تماشا بن جائے ،یا اللہ! اسے یہاں سے ہٹا دے' ابھی یہ دعا کر رہی تھی کہ امی نے آواز دے دی ، جلدی چھت پر آؤ لیکن کیسے باہر آؤں......؟ دیوار پر ''وہ'' ہے۔ میں نے منہ لٹکائے افسردہ لہجے میں جواب دیا، امی فوراً معاملہ کو سمجھ کر بولیں وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گی،تم خواہ مخواہ ڈرتی رہتی ہو، اگر ''وہ'' مجھ پر چھلانگ لگا کر گر پڑی تو پھر کیا ہوگا......؟ میرا ابھی تک وہی لہجہ تھا' امی میری اس بزدلی سے بہت خفا تھیں اس لڑکی کا کیا کریں اتنی بڑی ہو گئی ہے مگر عادتیں بچوں جیسی ہیں۔ ان چیزوں سے تو چھوٹے بچے بھی نہیں ڈرتے جتنا تم ڈرتی ہو۔ ہر ایسے وقت پر بولے جانے

والے الفاظ دہرا کر پھر بولیں کہ تم باہر نکلو اگر ''وہ'' کچھ کہے تو مجھے پکڑ لینا 'اب جلدی سے باہر آ جاؤ...... امی پلیز! آپ نیچے آ کر اسے یہاں سے ہٹا دیں یہ کہتے ہوئے میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ بھئی! مجھ سے بار بار نیچے نہیں آیا جاتا' لہٰذا تمہیں آج خود ہی نکلنا پڑے گا، کہا نہیں جائے گی ''وہ'' تمہیں...... امی کو غصہ آنے لگا اچھا پھر ہاجرہ (میری چھوٹی بہن) کو ہی آواز دیں کہ وہ باہر آئے، میں نے ڈر کر آنکھوں کا پانی صاف کرتے ہوئے کہا: ''ہاجرہ! باہر آؤ اور کوئی بڑی سی لاٹھی لے کر بہن کی مدد کو پہنچو! امی نے ہنستے ہوئے ہاجرہ کو آواز دی۔ وہ نیند کی وادی میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ امی کی آواز پر واقعی ہی لاٹھی لے کر باہر آئی اور مجھے پوچھنے لگی کیا ہوا؟ میں نے روتے ہوئے اسے بتایا کہ دیوار پر ''وہ'' ہے۔ ہاجرہ سمجھ گئی کہ مسئلہ کیا ہے تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد بولی: مجھے تو ''وہ'' نظر نہیں آ رہی...... ایسی چیزیں صرف تمہیں ہی نظر آتی ہیں ہمیں تو کبھی نظر نہیں آتیں اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر دیکھو تو تب تمہیں نظر آئے نا!...... تو بی بی تم کھول کر ہی چلتی ہو گی، مگر میری تو آدھی کھلی ہوئی آنکھیں بھی انہیں دیکھ لیتی ہیں' میں نے ہار مان لی! اب تم دیکھ بھی لو یا یوں ہی کھڑی ہو گی۔ پھر جلد ہی اس کی نگاہیں ''اسے'' دیکھنے میں ہی کامیاب ہو گئیں، نگاہ پڑتے ہی بول پڑی افسوس! اتنی چھوٹی تو ہے ''وہ'' اس سے کیا ڈرنا، اس کے بعد دیوار پر لاٹھی

مارنے لگی، میں اس پر مزید چیخنے لگی اگر اسے لگ گئی تو ہوسکتا ہے "وہ" اچھل کر میرے اوپر گر پڑے' اس لیے تم ذرا فاصلے پر مارو۔ ہاجرہ نے کتنی ہی دفعہ لاٹھی دیوار پر ماری لیکن "وہ" شاید زیادہ ہی ہٹ دھرم تھی اس پر ذرا برابر اثر نہ ہوا، میرا رونا بند نہ ہو رہا تھا۔ میں دل کی گہرائیوں سے اللہ کو پکار رہی تھی اور التجا کر رہی تھی کہ تو ہی میرا اللہ ہے میری مدد کر، وہ ابھی تک وہیں چمٹی ہوئی تھی۔ اب تو ہاجرہ بھی ڈرتے ڈرتے اپنا عمل جاری رکھے ہوئے تھی۔ تنگ گڑھا...... بند کوٹھڑی...... تاریکی...... سانپ...... بچھو...... دیگر زہریلے کیڑے مکوڑے...... بغیر اسلحہ کے تنہائی۔ میرے اندر جیسے دھماکے ہونے لگے اور میں سوچوں میں ڈوب گئی، اللہ نے وہاں مجھے میرے گناہوں کے سبب پکڑ لیا، اپنی رحمت سے محروم رکھا، میری بخشش نہ ہوئی تو پھر...... پھر کیا ہوگا؟ اب تو ایک کیڑا ہے اور میری جان پر بن گئی ہے وہاں تو وہ زہریلے سانپ ہوں گے جو ڈنگ ماریں گے، تو ستر سال تک اثر ختم نہ ہوگا، ان کے علاوہ دیگر کیڑے مکوڑے ہوں گے جو مجھے کاٹیں گے اور تکلیف میں مبتلا کریں گے۔ ہاجرہ نے میری سوچ کو توڑا اور بولی کہ "وہ" اوپر چلی گئی ہے اب باہر آ جاؤ، لیکن میں نے انکار کر دیا کیوں کہ "وہ" ابھی زیادہ اوپر نہیں گئی تھی، میری آنکھیں مسلسل آنسو بہا رہی تھیں، ہاجرہ نے مجھے دیکھا اور پھر اپنا کام شروع کر دیا۔ میں پھر سوچنے لگی،

یہ باتھ روم کافی کشادہ ہے اور اس میں دروازہ اور کھڑکی بھی ہے جبکہ اس کے برعکس قبر تنگ ہوگی اور دروازہ یا کھڑکی بھی نہ ہوگی یہ سوچ کر میرے آنسوؤں میں اور تیزی آ گئی، یہاں ڈر کر آواز دی تو میری بہن نکل آئی' یعنی جب بھی کوئی مسئلہ ہو کوئی نہ کوئی مدد کر دیتا ہے (اللہ کی توفیق سے ) مگر وہاں تو ایسا ناممکن ہے! میں چیخوں کی چلاؤں گی تو کون میری آواز سن کر آئے گا؟ کون مجھ سے زہریلے کیڑوں کو بھگائے گا؟ کون مجھے وہاں سے نجات دلانے کے لیے آگے بڑھے گا؟ نہیں نہیں' کوئی نہیں! میری پکار پر کوئی نہیں آگے بڑھے گا، بلکہ میری آواز کو تو جن وانس سنیں گے ہی نہیں 'پھر میرے اندر سے نہیں، نہیں کی آواز جنم لینے لگی۔

کیوں نا میں پہلے ہی اس صورت سے بچنے کا سامان تیار کرلوں، یہ ترکیب اچھی تھی کیوں کہ ابھی تو مجھے وقت مل گیا ہے کہ میں راہِ راست پر چل کر اپنے آپ کو گناہوں سے دور رکھنے کی کوشش کروں تاکہ کل کو اللہ مجھ پر اپنی رحمت کرے اور میری قبر کشادہ، روشن اور تمام خطرات سے پاک کر دے، ہاجرہ نے پھر میرا تسلسل توڑ ڈالا کہ ''وہ'' چلی گئی ہے' میرا سانس بحال ہوا اور میں نے تقریباً ڈرتے ہوئے آنکھوں کو چراتے ہوئے اس طرف دیکھا تو مجھے ''وہ'' نظر نہ آئی شاید ''وہ'' چھت پر چھپ گئی ہے۔ اچھا مجھے اس سے کیا لینا کہ ''وہ'' کہاں گئی ہے بہر حال ''وہ'' مجھے نظر تو نہیں آ

رہی تا۔ میں اپنے دل کو پر سکون محسوس کر کے اللہ کا شکر ادا کیا اور آنسو صاف کر کے منہ ہاتھ دھوئے اور تیزی سے باہر نکل آئی جیسے ابھی بھی کوئی خطرہ ہو۔

قارئین کرام! یہ حادثہ میرے ساتھ 14 مارچ بروز بدھ پیش آیا۔ میرے خیال میں آپ کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ ''وہ'' کیا چیز ہے۔ میرا اس روداد کے سنانے کا مقصد دکھاوا بالکل نہیں، میں قارئین سے گزارش کرنا چاہتی ہوں کہ جو میری طرح اپنی فطری عادت کے ہاتھوں مجبور ہوں، وہ اپنی اسی فطری عادت کے ذریعے مستفید ہوں اور اپنے خالق و مالک کو منا کر حقیقی کامیابی و کامرانی حاصل کر لیں۔

# تاشقند کا جوہری

پیارے بچو اور بچیو!......! یہ کہانی تاشقند کے ایک امیر زادے ''عارف بے'' کی ہے جس نے بری صحبت کا شکار ہو کر نہ صرف اپنی دولت گنوائی بلکہ اپنی زندگی کے آخری ایام جیل میں بسر کیے۔ عارف بے، روسی ترکستان جسے آج کل ''ازبکستان'' کہتے ہیں' کے ایک مشہور شہر تاشقند کا نامور جوہری تھا۔ وہ اپنے زمانے میں تاشقند بھر میں سب سے زیادہ امیر سمجھا جاتا تھا اور اسے دنیا بھر کی نعمتیں میسر تھیں' لیکن ایک نعمت جس سے وہ اب تک قدرت کی طرف سے محروم تھا اولاد کی تھی۔

ماں باپ کے لیے اولاد سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نعمت نہیں ہوتی۔ اور اسی نعمت کے لیے دونوں میاں بیوی اکثر اداس رہتے تھے، وہ ہر وقت اولاد کے لیے اللہ سے دعائیں مانگا کرتے تھے' کیونکہ جب انہیں اس بات کا خیال آتا کہ ہماری موت کے بعد دنیا میں ہمارا کوئی نام لیوا اور وارث نہ

ہوگا تو انہیں اولاد کی محرومی پر بے حد دکھ ہوتا۔ اکثر اوقات وہ اس قدر غمگین و اداس ہو جاتے کہ کئی کئی دنوں تک آپس میں ایک دوسرے سے بات چیت بھی نہ کرتے۔

آخرکار اللہ کو ان کی حالت پر ترس آگیا، اس کی رحمت جوش میں آگئی اور بڑھاپے کی عمر میں ان کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے "یعقوب بے" رکھا۔

یعقوب بے ایک امیر باپ کا لڑکا تھا اور اس کی پیدائش ایسے وقت میں ہوئی تھی جب اس کے والدین جوانی کے زمانے سے گزر کر بڑھاپے میں قدم رکھ چکے تھے، اس لیے والدین کے بے جا لاڈ اور پیار سے اس کی عادتیں بگڑ گئیں، پھر جب وہ دایہ کی گود میں پرورش پا کر ذرا بڑا ہوا تو اسے سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ مدرسے میں پہنچ کر اس کی لاڈلی طبیعت کے جوہر کھلے' کیونکہ اب وہ ایک بے حد لڑاکا' شریر اور گستاخ لڑکا بن چکا تھا۔ مدرسے میں وہ صرف اپنے ہم جماعت لڑکوں سے ہی نہ لڑتا بلکہ اکثر اپنے استادوں سے بھی نہایت گستاخی سے پیش آتا تھا' لڑکے تو ہمیشہ اس خیال سے کہ وہ ایک امیر باپ کا لڑکا ہے اگر ہم نے اس کی بات کا جواب طمانچے سے دیا تو یہ ہمیں اپنے نوکروں سے پٹوائے گا اور استاد کے پاس ہماری شکایت کرے گا' اس کے دھول دھپے کو برداشت کر کے چپ رہتے

تھے، لیکن اس کے استاد بھی اس کی بگڑتی ہوئی طبیعت سے واقف ہو کر حرف شکایت زبان پر نہ لاتے تھے۔ اس لیے کہ یعقوب بے کو پڑھانے کے معاوضے میں انہیں اس کے باپ کی طرف سے معقول رقم ملتی تھی۔ اس حالت میں یعقوب بے کی اخلاقی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی اور اس کی عادتیں روز بروز بگڑتی گئیں۔ پھر یعقوب بے کی عمر جب سولہ سال کی ہوئی تو اچانک اس کا باپ فوت ہو گیا اور اس کے چند ہی ماہ بعد اس کی ماں بھی مر گئی۔ اب وہ اپنے باپ کی تمام جائیداد کا تنہا مالک تھا۔ وہ اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی دولت کا وارث ہونے کی حیثیت سے ہر طرح آزاد تھا، اس لیے اب اس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔

اس کی عادتیں چونکہ بچپن میں ہی والدین کے بے جا لاڈ پیار سے خراب ہو چکی تھیں، اس لیے لڑاکا اور آوارہ گرد ہونے کی وجہ سے شریف لوگوں کے لڑکے تو اس سے دور ہی رہتے تھے اور جن لوگوں سے اس کی صحبت تھی وہ تاشقند بھر میں آوارہ اور لفنگے مشہور تھے۔ اس بری صحبت میں پڑنے کا اثر یہ ہوا کہ اس نے اپنے کاروبار کی طرف کبھی ہولے سے بھی توجہ نہ کی بلکہ تمام کاروبار اپنے ملازموں پر ہی چھوڑ دیا۔ ادھر اس کے باپ کے پرانے ملازموں نے جب دیکھا کہ نیا مالک اپنے کاروبار میں لا پروائی کر رہا ہے تو انہوں نے بھی کل پرزے نکالے اور آہستہ آہستہ مال ہضم کرنا

شروع کر دیا۔

دوسری طرف اس کے دوستوں نے جنھیں کوئی شریف زادہ اپنے پاس بٹھانا بھی گوارہ نہ کرتا تھا' اسے اپنے فائدے کے لیے برے راستے پر ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے باپ کی عمر بھر کی کمائی ہوئی دولت دو سال میں ہی ختم ہو گئی ۔ اب تاشقند کے نامور چودھری عارف بے کا لڑکا ایک بے حد مفلس و قلاش انسان تھا۔ اس کے آوارہ دوست اسے بری حالت میں دیکھ کر صاف کنارہ کر گئے، وہی دوست جو باتوں باتوں میں اس سے کہا کرتے تھے کہ ہمیں موت ہی اب زندگی میں ایک دوسرے سے جدا کر سکتی ہے خوشحالی اور عیش و عشرت کے دنوں میں تو شہد کی مکھیوں کی طرح اس سے چمٹے رہے' وہ اپنے فائدے کے لیے اسے نقصان پہنچانے سے بھی نہ چوکتے تھے' مگر مصیبت کے وقت میں انہوں نے یعقوب بے کی موت کا انتظار نہ کیا بلکہ اس سے پہلے ہی رفو چکر ہو گئے۔ اب یعقوب بے کو محسوس ہوا کہ مجھے اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے کیونکہ وہ ایک ایسے غار میں گر چکا تھا جس سے جیتے جی نکلنا اب اس کے لیے بے حد مشکل تھا' سوچنے اور سمجھنے کا وقت اب اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، گویا وہ ایک شیر سے زخمی ہو چکا تھا جس کے زخم کا بھرنا اب اس کے لیے دنیا کے کسی بھی مرہم سے ممکن نہ تھا۔

اس کے وہی ملازم جو کسی وقت اس کے سامنے بڑے ادب سے سر جھکاتے تھے اب بڑے فخر کے ساتھ پاس سے گزر جاتے' اور وہ دوست جو ہر وقت اس کے ساتھ چلے پھرتے تھے' اب اس بری حالت میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہ کرتے تھے' اسے جس دوست سے بھی امداد کی کچھ امید تھی وہی صاف آنکھیں چرا گیا اور رفتہ رفتہ وہ روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے بھی محتاج ہو گیا۔

وہی یعقوب بے جو بچپن میں مٹی کے کھلونوں کے بجائے سونے چاندی کے کھلونوں سے کھیلا کرتا تھا اور جس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ماں باپ کے لیے قانون کا حکم رکھتے تھے اور جس کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کرنا اس کے والدین اپنا فرض سمجھتے تھے' آج بھوکوں مر رہا تھا جبکہ اس نے اپنے جسم کو پھٹے پرانے کپڑوں سے چھپا رکھا تھا۔

ایک دن اسے دو روز کا فاقہ تھا اور وہ اس وقت شہر سے باہر ایک گھنے درخت کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں جبکہ فاقے سے اس کی جان پر بنی ہوئی تھی' اسے خیال آیا کہ کسی پرانے دوست کے پاس چلنا چاہیے' شاید کسی سے کچھ روپے ادھار ہی مل جائیں، یہی سوچتا ہوا وہ اپنے ایک پرانے دوست قادر کے پاس پہنچا جو کہ تاشقند کا مشہور بدمعاش تھا اور جس کا کام ہی یہی تھا کہ امیروں کے بچوں کو ورغلا کر ان کی مال و دولت

لوٹے۔ یعقوب بے نے قادر کے پاس جا کر کہا: اللہ کے لیے مجھے اس مصیبت سے نجات دلاؤ، میں اس وقت بھوک سے بے حال ہو رہا ہوں اور اگر مجھے شام تک کھانے کو نہ ملا تو میں جان دے دوں گا۔

قادر نے زمانے کے کئی رنگ دیکھے تھے، جس کو زندگی میں سینکڑوں نوجوانوں سے واسطہ پڑا ہو اس کے پتھر دل پر بھلا یعقوب بے کے یہ الفاظ کیا اثر کر سکتے تھے!! اس نے یعقوب بے کی طرف دیکھ کر بے نیازی سے کہا: میں آخر تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ ہاں، ایک صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ تم میرے مکان پر آنے جانے والوں کی خدمت کیا کرو اور ضرورت پڑنے پر بازار سے سودا سلف بھی خرید لایا کرو تو میں تمہیں روٹی کپڑے کے عوض ملازم رکھ سکتا ہوں، اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی کام نہیں۔ یعقوب بے کے لیے قادر کے یہ الفاظ نہ تھے بلکہ ایک تیر تھا جس نے اس کے دل کو زخمی کر دیا، کیونکہ قادر کے گھر اکثر وہی لوگ آیا کرتے تھے جو کبھی یعقوب بے کے دستر خوان پر مکھیوں کی طرح بھنبھنایا کرتے تھے۔

اس لیے وہ قادر کو کوئی جواب دیے بغیر اس کے مکان سے نکلا اور اپنی موجودہ حالت پر آنسو بہاتا ہوا ایک طرف کو چل دیا، لیکن بھوک سے نڈھال ہونے کے باعث اب اس کے لیے ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر تھا۔

اسی دوران شام کے وقت پھرتے پھراتے وہ ایک مسجد کے قریب

پہنچا اور اس نے دروازے میں سے جھانک کر اندر کی طرف دیکھا تو لوگ اس وقت مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے' اچانک اس کے دل میں ایک نیا خیال پیدا ہوا اور وہ بغیر تامل کیے مسجد میں داخل ہو گیا، پھر جلد ہی وہ کسی نمازی کی جوتی بغل میں دبائے باہر نکلا اور کباڑی بازار کی طرف چلنے لگا' جہاں پرانی چیزوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ بازار کے سرے والی دکانوں کے پاس پہنچتے ہی اس نے مسجد سے چرائی ہوئی جوتی اونے پونے داموں بیچ دی' کیونکہ بھوک اور تھکان کی وجہ سے اب وہ ایک قدم بھی آگے نہ اٹھا سکتا تھا' اگرچہ اسے معلوم تھا کہ بازار کے درمیان میں جو دکانیں ہیں وہاں وہ کچھ زیادہ پیسے لے کر جوتی فروخت کر سکتا تھا' لیکن اس وقت تو اسے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے صرف روٹی کی ضرورت تھی، اس لیے وہ جوتی فروخت کر کے سیدھا نانبائی کی دکان میں گھس گیا اور پیٹ بھر کر روٹی کھانے کے بعد پھر ایک درخت کے نیچے آ کر لیٹ گیا' اس دن کے بعد تو اس نے یہی وطیرہ بنا لیا کہ آنکھ بچا کر کسی کی چیز چراتا اور کباڑی بازار میں فروخت کر کے کسی نہ کسی طرح سے پیٹ کی آگ بجھا لیتا۔

ایک دن وہ آوارہ گردی کرتے ہوئے کاروان سرائے میں پہنچا جہاں دور دور کے علاقوں سے قافلے آ کر ٹھہرا کرتے تھے اور یہ سرائے شہر سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھی۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے، چاند بھی نہیں

نکلا تھا اور عنقریب ایک بہت بڑا قافلہ وہاں پہنچنے والا تھا۔ تمام مزدور سڑک کے کنارے ادھر ادھر بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ یعقوب بے بھی ان میں جا بیٹھا، تقریباً ایک گھنٹے کے بعد قافلہ آیا اور مسافر اونٹوں سے اترنے لگے، پھر مزدور مسافروں کا سامان اٹھا کر شہر کی طرف چلنے لگے۔ یعقوب بے بھی ایک بوڑھی عورت کے قریب آیا جو کسی کا انتظار کر رہی تھی' اس نے بوڑھی عورت سے مخاطب ہو کر پوچھا:

اماں جان! کیا آپ کو مزدور چاہیے؟

بوڑھی اماں نے جواب دیا: ہاں بیٹا!

کہاں جاؤ گی اماں جی؟ یعقوب بے نے پھر پوچھا۔

بوڑھی نے جواب دیا: میں ہاشم کی گلی تک جاؤں گی بیٹا!

یعقوب بے نے بڑھیا کے ہاتھوں سے گٹھڑی لی اور للچائی ہوئی نگاہوں سے اس کی سونے کی چوڑیوں کی طرف دیکھنے لگا' جو وہ اپنے ہاتھوں میں پہنے ہوئے تھی، اس کے دل میں بڑھیا کی چوڑیاں حاصل کرنے کا خیال آیا اور پھر یہ خیال اس کے دل میں مضبوط ہو کر رہ گیا' وہ بڑھیا کو باہر لے جانے کے بجائے ویرانے میں لے آیا جہاں چاروں طرف موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یہاں پہنچ کر اس نے گٹھڑی کو ایک طرف پھینک دیا اور بوڑھی سے نہایت گرج دار آواز میں بولا: ہاں مائی! اب اگر تم اپنی

جان کی خیر چاہتی تو فوراً چوڑیوں کو اپنے ہاتھ سے اتار کر میرے حوالے کر دو!

بوڑھی عورت اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر پہلے تو کچھ ڈری مگر پھر صاف انکار کر دیا' لیکن جونہی اس نے غور سے دیکھا کہ یعقوب بے اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہاتھ میں ایک چمک دار خنجر لیے کھڑا ہے تو وہ مارے خوف کے لرز کر رہ گئی اور فوراً چوڑیاں اتار کر یعقوب بے کے حوالے کر دیں۔ وہ چوڑیاں لے کر شہر کی طرف چلنے لگا' لیکن ابھی چند ہی قدم گیا ہوگا کہ ٹھہر گیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے دل میں کیا خیال پیدا ہوا' وہ پلٹ کر بڑھیا کے قریب آیا جو ابھی تک اسی جگہ کھڑی خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ بڑھیا سے مخاطب ہو کر بولا: تمہیں زندہ چھوڑ دینا ایک خطرناک غلطی ہوگی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کل کو تیری ذات میرے لیے کسی مصیبت کا باعث بن جائے، اس لیے کیوں نہ ابھی تیری زندگی کا بھی خاتمہ کر دوں۔

یہ کہہ کر اس نے اپنی پگڑی کے کپڑے سے بڑھیا کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیئے' پھر اسے قتل کرنے کے لیے اپنا خنجر اٹھا لیا' بڑھیا نے خوف سے چلاتے ہوئے کہا مجھے نہ مارو! میں تمہیں اپنے سچے دل سے کہتی ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی' مجھے نہ مارو بیٹا! میری دنیا میں صرف

ایک ہی بیٹی ہے جو سخت بیمار ہے' اسے ملنے کے لیے یہاں آئی تھی میں! یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں' یعقوب بے نے ایک بار غضب آلود نگاہوں سے بڑھیا کی طرف دیکھا مگر اب اس کا دل کچھ نرم ہوگیا' پاؤں ڈگمگائے اور ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے خنجر ایک طرف رکھ دیا جو پانی کے ایک گڑھے میں جا گرا۔ مگر ساتھ ہی اس کے دل میں اس وقت نیکی اور بدی کی جنگ ہو رہی تھی، نیکی اسے قتل سے روک رہی تھی تو بدی اکسا رہی تھی کہ اگر تو نے اس وقت بڑھیا کو زندہ چھوڑ دیا تو پھر تیری خیر نہیں' آخر بدی نیکی پر غالب آ گئی اور وہ خنجر نکالنے کے لیے پانی کے گڑھے میں اتر گیا۔ بڑی مشکل سے اس نے پانی میں خنجر کو تلاش کیا مگر جب باہر نکلنے کے لیے پاؤں اٹھانا چاہا تو اس کا پاؤں نہ اٹھ سکا' اسے محسوس ہوا کہ اس کا پاؤں کسی مضبوط چیز نے جکڑ رکھا ہے۔ اس کے بعد ساری رات وہ اس گڑھے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے' لیکن اس کا پاؤں چھٹکارا حاصل نہ کر سکا۔ رات گزر گئی اور صبح کی روشنی دور دور تک پھیلنا شروع ہوگئی' اتنے میں دور سے بڑھیا کو چند آدمی اس طرف آتے ہوئے نظر آئے قریب پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان پانی کے گڑھے میں کھڑا ہے اور اس سے ذرا فاصلے پر ایک بوڑھی عورت زمین پر بندھی پڑی ہے۔ ایک شخص نے بڑھیا سے پوچھا:

کیوں اماں جی کیا بات ہے؟

بڑھیا نے نہایت کمزور آواز میں جواب دیا: ”پہلے تو میرے ہاتھ پاؤں کھول دو، پھر میں سارا واقعہ سناتی ہوں“۔ یہ سنتے ہی ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے بوڑھی عورت کے ہاتھ پاؤں کھول کر اسے آزاد کر دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر رات کا سارا گزرا ہوا واقعہ انہیں کہہ سنایا۔

# لاشیں چوراہوں میں لٹکا دی گئیں

یہ 658ء کی ایک گرم صبح تھی۔ مصر کے بازاروں میں کاروبارِ زندگی شروع ہو چکا تھا' چند سوار جو اپنے لباسوں سے سفارت کار نظر آتے تھے، اپنی گردنیں اکڑائے، بے فکری سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے قاہرہ کی طرف رواں دواں تھے۔ ان کے چہرے تاتاریوں کی درندگی کے مظہر تھے، راستے میں ان کا واسطہ پناہ گزینوں کے ان تباہ حال قافلوں سے پڑ رہا تھا جو بغداد کی تباہی کے بعد مصر کے گلی کوچوں میں امن کی کوئی جگہ تلاش کر رہے تھے جونہی ان کی نظر پناہ گزینوں کے کسی قافلے پر پڑتی ان کے چہرے خوشی سے یوں چمک اٹھتے جیسے درندے اپنے شکار کو زندگی اور موت کی کشمکش میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان پناہ گزینوں نے تاتاریوں کی درندگی کے مظاہرے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے' اس لیے وہ تاتاریوں سے خوفزدہ تھے۔ ان کی آمد کی خبر سن کر ان کی زبان سے یہی الفاظ نکلے تھے:

''تاتاری آ گئے۔'' تاتاری سفیروں کی آمد کا مطلب تباہی و بربادی

حالانکہ یہ وہی مصر تھا جس نے صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں یورپ کی عیسائی افواج کو ذلت سے دوچار کیا تھا۔ اسی مصر نے چند سال قبل ساتویں صلیبی جنگ میں شاہِ فرانس کو عبرتناک شکست دی تھی لیکن آج مصری مسلمان بھی اس فتنے کی قوت سے لرز رہے تھے جس نے دریائے جیحوں سے فرات تک عالم اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ یہ فتنہ تاتار تھا جو چنگیز خان کی صورت میں نمودار ہوا اور اب ہلاکو کی صورت میں مسلمانوں کے لیے مستقل خطرہ بن چکا تھا۔ تاتاری سفارت بھی ہلاکو کی بھیجی ہوئی تھی۔ تاتاری سفیر اس وقت مصر کے بادشاہ ملک مظفر الدین کے دربار میں کھڑے تھے' ان کا انداز ایسے تھا جیسے مصر ان کی جاگیر اور ملک المظفر ان کا غلام ہے انہوں نے گستاخانہ انداز میں اپنے آقا ہلاکو خان کا خط ملک المظفر کے سامنے پھینک دیا، خط میں لکھا تھا:

"یہ اس کا فرمان ہے جو ساری دنیا کا آقا ہے، ہماری اطاعت قبول کرلو تو تمہیں امن سے زندہ رہنے دیا جائے گا، اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو جو تم کو پیش آئے گا وہ بلند و بالا آسمان والے کے سوا کوئی نہیں جانتا"۔ چند لمحے بعد سلطان نہایت نرم لہجے میں ایلچیوں سے مخاطب ہوا: ہلاکو کا ہم نے کچھ نہیں بگاڑا اسے ہم پر حملہ کرنے سے باز رہنا چاہیے"۔ سلطان کے جواب سے تاتاریوں کے بگڑے ہوئے چہرے مزید بگڑ گئے اور

وہ نہایت بدتہذیبی سے بولے: ''تم نہایت خودسر اور ضدی حکمران ہو تم ہم سے واقف نہیں ورنہ انکار نہ کرتے''۔

''ایلچیوں کا لہجہ سلطان کی برداشت سے باہر تھا: تم ایلچی ہو اور ایلچی ہی رہو، اپنا لہجہ درست رکھو اور ہمیں سبق نہ پڑھاؤ''۔ سلطان کی آواز میں غصہ تھا۔ سلطان کی بات سن کر تاتاری ایلچی غصے میں چلانے لگے: ''تم ہماری بات نہیں مانو گے ہماری طاقت اور شجاعت کے افسانے شاید تم نے نہیں سنے''۔ ایلچیوں کے گستاخانہ جواب سن کر مصر کے کئی امراء کا پیمانہ صبر سے لبریز ہو چکا تھا۔ ''خاموش'' پہلی صف میں بیٹھے ایک نوجوان امیر کی آواز سے دربار لرز اٹھا' اس کی تلوار میان سے باہر آ چکی تھی ''اگر مجھے سلطان کا لحاظ نہ ہوتا تو اللہ کی قسم! میں تمہاری گردنیں تمہارے دھڑ سے الگ کر دیتا'' نوجوان کی آواز جوش و غضب سے لرز رہی تھی۔

''سلطان معظم! ان کا رویہ سفارتی آداب کے منافی ہے۔ شاید ہلاکو نے اپنے سپاہیوں کو نہتے انسانوں کے قتل کے سوا کچھ نہیں سکھایا ورنہ یہ اس طرح یہاں چلا نہ رہے ہوتے مجھے اجازت دیں کہ ان کے سر کاٹ کر لاشیں قاہرہ کے چوراہوں میں لٹکا دوں تاکہ آئندہ ہلاکو اپنے سفیروں کو مصر بھیجتے وقت سفارتی آداب ضرور سکھائے''۔ یہ امیر جس کی تلوار بھرے دربار میں میان سے باہر آ گئی تھی اور جس نے تاتاریوں کی لاشوں کو عبرت کا

نشان بنا کر مصر کے چوراہوں پر لٹکا دیتا تھا' مصری عوام کے لیے ناواقف نہیں تھا ابھی چند سال قبل منصورہ کے درمیان میں لڑی جانے والی ساتویں صلیبی جنگ میں اس نوجوان کی حیرت انگیز حربی چالوں سے عیسائی لشکر کو عبرت ناک شکست ہوئی تھی، منصورہ کا یہ مردِ میداں جس کا بچپن غلاموں کی منڈیوں میں بکتے ہوئے گزرا اہلِ مصر کی دھڑکنوں میں بستا تھا، لوگ اسے ''امیر رکن الدین بیبرس'' کے نام سے جانتے تھے۔

# دیانتداری کا انعام

**اللہ اکبر اللہ اکبر......**

**اشہد اللہ لاالٰہ الا اللہ......**

**اشہد ان محمد الرسول اللہ......**

مسجد الحرام سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو بوڑھے ابوغیاث نے مسجد کا رخ کیا ۔ یہ رمضان المبارک کی پہلی صبح تھی۔ خانہ کعبہ کے اردگرد نمازیوں کی صفیں بنتی چلی جا رہی تھیں کچھ نمازی سحری سے فارغ ہو کر آ رہے تھے۔ بوڑھا ابوغیاث بھی مسجد کی طرف جا رہا تھا لیکن بھوک کی وجہ سے اس سے چلنا دشوار تھا۔ یہی حال اس کا نماز میں تھا' بھوک کی شدت کی وجہ سے اس کے پیٹ میں درد تھا اور درد کی وجہ سے ابوغیاث سے کھڑا ہونا مشکل ہو گیا تھا' جیسے تیسے اس نے نماز پڑھی اور ذکر و اذکار سے فارغ ہو کر ایک جگہ کونے میں بیٹھ گیا۔ غم کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر صاف واضح تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر اس کے تنگی کے دن کب ختم ہوں گے۔ پہلے تو

تنگ دستی کی وجہ سے جیسے تیسے گزارا ہو رہا تھا لیکن اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ پچھلے دو دن سے گھر کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ آج پہلا روزہ ہے اور سحری کے لیے بھی کچھ دستیاب نہیں۔ وہ دیر تک سوچتا رہا' پھر اٹھ کر اسی حالت میں گھر آ گیا۔ ابو غیاث کی بیوی لبابہ نے اپنے شوہر کو یوں پریشان دیکھا تو وہ بولی ابو غیاث آج تیسرا دن ہے کہ ہم نے کھانا نہیں کھایا۔ یہ گرمی کے دن ہیں اور ویسے بھی آج روزہ ہے ہم تو جیسے تیسے صبر کر کے دن گزار ہی لیں گے' لیکن ان بچیوں کا کیا بنے گا' بھوک نے ان کا برا حال کر رکھا ہے۔ آپ ہمت سے کام لیں اور روزی کی تلاش میں جائیں ہو سکتا ہے کہ کہیں کام مل جائے اور اس سے ہم کھانے پینے کی اشیاء خرید سکیں' تا کہ روزہ بھی افطار کیا جا سکے۔ ابو غیاث بیوی کی بات سن کر چپ رہا، اس کی بیوی نے پیوند لگی ہوئی میلی کچیلی قمیض اس کی طرف بڑھائی اور کہا:

"جائیے !اللہ بہتر کرے گا" ابو غیاث اٹھا اور گھر سے کام کی تلاش میں نکل گیا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا مکہ کے بازاروں میں لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی ابو غیاث کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا مگر کہیں کام نہ مل سکا۔ آسمان پر سورج بلند ہو چکا تھا اور اس کی دھوپ میں شدت آ چکی تھی۔ ابو غیاث کئی دن کا بھوکا تھا وہ بھوک اور گرمی سے نڈھال ہو کر ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ گیا۔ بوڑھے ابو غیاث کو اداسی نے آ گھیرا۔ وہ

دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر سوچنے لگا کہ اگر آج بھی اسے کام نہ ملا تو پھر کیا بنے گا......؟ گھر میں بچیاں بھوکی ہیں۔ اس کی بیوی کی بوڑھی ماں بھی گھر پر ہے اور اس نے بھی تین روز سے کچھ نہیں کھایا۔ خود ابو غیاث کی یہ حالت تھی کہ کمزوری کی وجہ سے اس کے جسم میں اتنی سکت بھی نہ رہی تھی کہ وہ اٹھ سکے۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے پیٹ میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس کی بڑی تمنا یہ تھی کہ اسے ایمان کی حالت میں موت آ جائے تا کہ وہ اس قید حیات سے رہائی پا جائے اور ہمیشہ کی زندگانی سے فائدہ اٹھائے۔ وہ انہی سوچوں میں گم بیٹھے بیٹھے مٹی کریدنے لگا کہ اچانک اس کا ہاتھ ایک نرم و ملائم چیز سے لگا اسے کچھ یوں محسوس ہوا کہ جیسے سانپ کی دم ہے۔ اس نے اعوذ باللہ پڑھی اور ہاتھ کھینچ لیا' پھر دل ہی دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش! یہ سانپ ڈس لے اور میں مصائب سے آزاد ہو جاؤں' لیکن فوراً خیال آیا کہ مومن کو ایسی بات نہیں سوچنی چاہیے۔ چنانچہ اس نے اللہ سے معافی مانگی اور دوبارہ اس چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے بڑا تعجب ہوا کہ یہ بے حس و حرکت پڑی ہے۔ اسے پاؤں سے ٹھوکر بھی لگائی لیکن وہ چیز بے حس پڑی رہی۔ اس نے ہاتھ سے مٹی ہٹا کر اسے پکڑا تو وہ دیناروں سے بھری ہوئی تھیلی نکلی جو سونے سے بھری ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر بھوک' پیاس ختم ہو گئی اور اعصاب میں نئی قوت پیدا ہو گئی۔ ابو غیاث سوچنے لگا کہ

میں کتنا خوش نصیب ہوں؟ یہ مال اپنے گھر والوں کے ہاتھوں میں تھماؤں گا تو وہ کس قدر خوش ہوں گے؟ حسین اور روشن مستقبل کی امید میں وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

اچانک ایمانی حس بیدار ہوئی دل میں القاء ہوا کہ یہ مال تیرا نہیں بلکہ گم شدہ ہے۔ سال بھر اعلان کرنے کے بعد اس صورت میں حلال ہوگا جب اصل مالک نہ ملے۔ جب سال کی مدت اور اپنے رات کے کھانے کا تصور کیا تو ذہن نے جواب دیا کہ "سال بھر زندہ بھی رہوں گا یا نہیں؟ اور یہ بھوکی بیٹیاں کیا کھائیں گی اور کیا پہنیں گی؟ خواہش پیدا ہوئی کہ تھیلی کو واپس اسی جگہ رکھ آئے اور آزمائش میں نہ پڑے لیکن دانا عالم مومن تھا، جانتا تھا کہ اگر گم شدہ مال کو دیکھ کر ہاتھ نہ لگایا جائے تو کوئی ذمہ داری نہیں۔ اگر اسے پکڑ کر دوبارہ رکھ دیا جائے تو ذمہ داری رکھنے والے پر ہوگی ۔ اس قسم کے تفکرات دماغ میں ٹکرانے لگے ۔ اسے محسوس ہوا کہ کنپٹی کی ہڈیاں چور ہو رہی ہیں ۔ ایک طرف سے یہ خیال اٹھتا کہ دبا رکھو، اللہ کا دیا ہوا رزق ہے ۔ اس کے ذریعے بھوکی بیوی اور بیٹیوں کا پیٹ بھرو اور ان کے تن ڈھانکو۔ اگر طاقت ہوئی تو پھر دے دینا ورنہ چند دینار کم بھی واپس کیے تو کیا فرق پڑے گا۔

دوسری طرف یہ خیال پیدا ہوتا کہ صبر کر اے بھلے آدمی!

امانت میں خیانت کا ارتکاب نہ کر، قبر کے کنارے بیٹھ کر مالک کی نافرمانی کا سوچتا ہے۔ چنانچہ پھر وہ اصل مالک کے ملنے تک تھیلی گھر رکھنے چلا گیا۔ چوروں کی طرح گھر میں داخل ہوا تو اس کی بیوی نے دیکھ لیا اور پوچھا: ابوغیاث کیسے آئے اور کیا لائے ہو؟

جواب دیا: کچھ نہیں!

ابوغیاث تھیلی کی خبر چھپانا چاہتا تھا جبکہ اس نے آج تک بیوی سے کوئی خبر چھپائی نہ تھی۔ بیوی نے کہا: ''واللہ! آپ کے پاس کچھ ضرور ہے لیکن یہ ہے کیا؟ بتا دو نا!''

ابوغیاث ڈرا کہ اس کی بیوی کہیں کسی وہم میں مبتلا نہ ہو جائے' اسے سارا قصہ سنا دیا۔ وہ عورت دین دار ضرور تھی لیکن ابوغیاث کی طرح صبر اور حوصلے والی نہ تھی۔

کہنے لگی: ''جاؤ اور کچھ خرید لاؤ کیونکہ ہم لاچار ہیں اور لاچار پر مردار بھی حلال ہے۔''

ابوغیاث نے کہا: نہیں ہرگز نہیں۔ اگر تو نے اسے ہاتھ لگایا یا کسی کو خبر کر دی تو تجھے طلاق ہے۔

لبابہ خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گئی اور یہ اصل مالک کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا تاکہ اصل مالک سے مل کر حلال طریقے سے کوئی درہم

حاصل کر سکے۔ وہ حرم کی طرف چل دیا۔

ابو غیاث حرم میں پہنچا ہی تھا کہ ایک خراسانی نوجوان کو یہ اعلان کرتے ہوئے سنا: ''اے حاجیوں کی جماعت! میری ہزار دینار سے بھری ہوئی تھیلی کہیں گم ہو گئی ہے جو کوئی اسے واپس کرے اللہ اسے ثواب دے گا۔''

ایک بوڑھا بزرگ اٹھا اور کہنے لگا: ''اے خراسان کے رہنے والے نوجوان! ہمارا ملک پسماندہ ہے' حالت ابتر ہے' شاید آپ کی تھیلی کسی اللہ کا خوف رکھنے والے انسان کو مل گئی ہو؟ آپ اس کے لیے انعام کا اعلان کر دیں' جسے لے کر وہ باقی واپس کر دے۔

نوجوان خراسانی نے پوچھا: ''ہاں' بھئی کتنا انعام؟''

ابو غیاث نے کہا: سو دینار' یعنی دسواں حصہ! نہ بھئی نہ' ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں یہ معاملہ اللہ پر چھوڑتا ہوں۔ خراسانی نے جواب دیا۔ جب کچھ بات نہ بنی تو ابو غیاث خستہ حال اپنے مکان میں واپس آیا اور بولا: ''لبابہ کہاں؟ لبابہ بولی: حاضر ہوں...... حاضر ہوں ابو غیاث!

میں نے ایک شخص کو اس تھیلی کی تلاش میں پھرتے ہوئے دیکھا ہے' میں نے اسے یہ بھی کہا کہ تو اس کے واپس کرنے والے کے لیے سو دینار انعام کا اعلان کر دے لیکن وہ نہیں مانتا۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میرا

ارادہ تو تھیلی واپس کرنے کا ہے۔

لبابہ نے کہا: ''ابو غیاث ! ہمیں تیرے ساتھ پچاس سال فقر و فاقہ میں گزارنے پڑے ہیں ۔ تیری چار بیٹیاں ، دو بہنیں ، ایک ساس اور آٹھویں میں ہوں۔ ابو غیاث اللہ بڑا مہربان ہے ۔ اس کی شان اس امر سے بلند ہے کہ ایسے آدمی کو عذاب کرے جو ان کا واحد کفیل ہو تو نے نہ تو چوری کی ہے اور نہ ڈاکا ڈالا ہے' یہ مال تو اللہ نے تیرے سامنے رکھا ہے تو اسے کیوں ٹھکراتا ہے ! کیا اللہ تجھ سے ان عورتوں کے متعلق سوال نہیں کرے گا؟

بوڑھے ابو غیاث کے چہرے سے معلوم ہوا کہ اس کا دل ان بھوکی بیٹیوں اور مسکین ام لبابہ پر آنسو بہا رہا ہے کیونکہ فاقوں کی بدولت ان کا چمڑا ہڈیوں پر خشک ہو رہا تھا اور وہ دیمک خوردہ لکڑی کی طرح کھوکھلے بدن میں سانس لے رہی تھیں ۔

اس کے دل میں آیا کہ کچھ دینار خرچ کر لوں لیکن فوراً یاد آیا کہ پچاس سال صبر سے گزار دیے اور آج جبکہ قبر میں ٹانگیں لٹکی ہوئی ہیں تو پچاس سال کے صبر کو ایک دن کی لذت پر کیوں قربان کروں اور پھر اللہ تعالیٰ میرے اہل و عیال پر ارحم الراحمین ہے ، دل کو حوصلہ دے کر بولا: '' میں ایسا نہیں کروں گا، چھیاسی سال بعد اپنی لاش کو قبر میں نہیں جلاؤں گا۔

"اگلے دن خراسانی نوجوان حرم میں پھر وہی صدا لگا رہا تھا کہ جو کوئی میری ہزار دینار والی تھیلی واپس کر دے اللہ تعالیٰ اسے اجر دے گا۔ وہی بوڑھا بزرگ اس کی خدمت میں عرض کرنے لگا کہ" اے نوجوان! میں نے تجھے کہا تھا کہ ہمارا ملک بے آب و گیاہ ہے، وسائل زندگی کم ہیں۔ شاید وہ تھیلی کسی خوف الٰہی رکھنے والے کو مل جائے تو انعام کے لالچ میں واپس کر دے۔ چلو سو دینار نہ سہی تو دس دینار کا ہی اعلان کر دے۔

اس نے کہا: "ہرگز نہیں بلکہ میرا اور تھیلی اٹھانے والے کا فیصلہ قیامت کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہوگا۔"

تیسرا دن ہوا تو خراسانی نوجوان پھر حرم میں وہی صدا لگا رہا تھا اور وہی ابو غیاث کھڑا ہوا اور کہنے لگا:" اے نوجوان! تو نے سو دینار کا اعلان کرنے سے انکار کر دیا' پھر دس دینار کا انعام دینے سے بھی انکار کر دیا تو آج ایک دینار کا ہی اعلان کر دے۔ شاید کہ تھیلی اٹھانے والا اس حلال دینار کے لالچ میں واپس کر دے اور نصف دینار سے کھانا خرید لے اور نصف سے مشک خرید کر اس سے حاجیوں کو اجرت پر پانی پلایا کرے۔"

خراسانی نے کہا: "نہیں! بلکہ میں اس کام کا فیصلہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑتا ہوں۔"

ابوغیاث کی امید کا آخری سہارا بھی ختم ہو گیا اور سوچنے لگا کہ ابھی تو

ہزار دینار ہاتھ میں ہیں۔ سارا نہ سہی تو ایک دینار ہی رکھ لوں تا کہ بھوکے پیٹوں کا سامان کر سکوں گا لیکن دینی جذبہ موجزن ہوا اور یوم الحساب کے خیال سے ڈر گیا اور سوچا کہ پچاس سال کے صبر کو ایک دن کی لذت پر قربان کر دینا سراسر گھاٹا نہیں تو اور کیا ہے؟ کیونکہ تمام عمر کی لذتیں آخر کار جہنم کے ایک جھونکے سے بھول جائیں گی اور ساری عمر کی محرومیاں جنت کے ایک دیدار سے کافور ہو جائیں گی۔

ابو غیاث نے خراسانی نوجوان سے کہا: ''آؤ اور اپنی تھیلی لے جاؤ۔''
جب دونوں گھر کے دروازے پر پہنچے تو ابو غیاث اندر داخل ہو گیا تھوڑی دیر بعد باہر آیا اور خراسانی نوجوان کو اندر لے گیا۔ ابو غیاث نے اندر جا کر محفوظ جگہ سے تھیلی نکالی اور نوجوان سے کہا: ''کیا تھیلی یہی ہے؟''

نوجوان نے کہا: ''ہاں۔''

پھر اس کا سر کھول کر دینار دامن میں پلٹے اور گنے تو پورے ہزار نکلے پھر کہا: ''یہ تیرے ہیں۔''

لبابہ اور اس کی بیٹیاں یہ منظر دروازے کے سوراخ سے دیکھ رہی تھیں جیسے بھوکا دیگ کی طرف دیکھتا ہے اور صرف چند لقموں کی تمنا کرتا ہے۔

خراسانی نے وہ دینار کندھے پر رکھ کر اوپر چادر ڈال دی اور چل دیا۔ لبابہ نے یہ منظر دیکھا تو یوں چکرائی جیسے کسی عورت کا اکلوتا بیٹا گم ہو گیا

ہو۔ اس کی بیٹیوں کی باچھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

چند لمحوں بعد ابوغیاث اس سے روگردانی کر لیتا تو یہ بڑی بات نہ تھی کیونکہ اس نے ان بھوکے مسکینوں کو دیکھ کر بھی ایک دینار نہ دیا تاکہ وہ اپنی بھوک دور کر سکیں، لیکن ابوغیاث بڑا بردبار اور حوصلے والا شخص تھا۔ فوراً بولا: "بتاؤ! بیٹا کیسے آنا ہوا؟

خراسانی نوجوان نے جواب دیا:

"اے بزرگ! میرا باپ فوت ہوا تو اس کے پاس تین ہزار دینار تھے۔ اس نے مجھے وصیت کی تھی کہ میری سواری بیچ کر حج کا خرچ بنا لینا اور ہزار دینار اس شخص کو دینا جو بہت زیادہ غریب ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے وطن خراسان سے لے کر مکہ تک کسی کو تجھ سے زیادہ غریب نہ پایا۔ یہ لو یہ دینار، اللہ ان میں تمہارے لیے برکت کرے۔"

جب گھر پہنچے تو ابوغیاث نے بلند آواز سے پکارا: لبابہ!

ابوغیاث کی آواز سن کر سب بیٹیاں اکٹھی ہو گئیں۔ ابوغیاث نے سب کو خوش خبری سنائی کہ اللہ نے ہمیں دیانت داری کا صلہ یہ دیا ہے کہ ہم ہزار دینار کے مالک ہو گئے ہیں۔ مغرب کی اذان ہوئی تو اس ابوغیاث کے اہل خانہ بھی عمدہ عمدہ کھانوں کے اردگرد بیٹھ گئے۔ ابوغیاث بزرگ نے اپنی بیوی لبابہ سے کہا:

اے لبابہ! دیکھ لیا تو نے اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ ہم نے اپنے آپ کو حرام کے ایک دینار سے بچایا تو اللہ تعالیٰ نے ہم کو حلال کے ذریعے سے ہزار دینار عطا کیے۔'' یہ ابوغیاث چند لقمے کھا کر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر جانے لگا تو لبابہ نے کہا: ''کہاں جا رہے ہو ابو غیاث؟''

''میں کسی فقیر روزے دار کو تلاش کرنے جا رہا ہوں تا کہ اسے اپنے کھانے میں شریک کروں۔''

# جھوٹے نبی کی دعا قبول ہوگئی!

مولانا ثناء اللہ امرتسری ایک مشہور عالم دین اور بہت بڑے مناظر اسلام تھے۔ انہوں نے قادیانیت کو ناکوں چنے چبوائے۔ اس وقت نبوت کا دعویٰ کرنے والا مرزا غلام احمد قادیانی مولانا ثناء اللہ کو اپنا شدید ترین مخالف سمجھتا تھا' مولانا نے ہر حال میں مرزا کا تعاقب کیا اور اسے بری طرح ذلیل ورسوا کیا۔ ایک دفعہ مولانا ثناء اللہ نے مرزا غلام احمد کی سب پیشین گوئیوں کو غلط ہونے کا اعلان کیا جو اس نے کی تھیں۔ مرزا یہ سنتے ہی غصے میں آ گیا اور انہیں قادیان آ کر ان پیشین گوئیوں کی تحقیق کی دعوت دی اور ان کے غلط ہونے پر اپنی طرف سے انعام کا اعلان کیا۔ مرزا نے مولانا ثناء اللہ امرتسری کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا: اگر مولانا سچے ہیں تو قادیان آ کر کسی پیشین گوئی کو جھوٹی ثابت کریں اور ہر ایک پیشین گوئی کے لیے ایک ایک سو روپیہ انعام دیا جائے گا اور آنے جانے کا کرایہ علیحدہ ۔(ضمیمہ نزول المسیح ص28 رخ جلد19 ص:118)

اس نے اپنے چیلنج کو بار بار دہرایا مرزا جانتا تھا کہ قادیان آ کر ڈیڑھ سو پیشین گوئیوں کی تفتیش کرنا اور اتنا عرصہ قادیان میں رہنا کوئی آسان کام نہیں اور یہ بھی کہ ایک مصروف آدمی کے لیے وقت نکالنا ایک مشکل ترین مسئلہ ہے لہٰذا مولانا صاحب کبھی بھی قادیان نہیں آئیں گے جو کہ میری جیت ہوگی۔

مرزا غلام لکھتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ وہ قادیان میں تمام پیشین گوئیوں کی جانچ پڑتال کے لیے میرے پاس نہیں آئیں گے اور سچی پیشین گوئیوں کی اپنے قلم سے تصدیق کرنا، ان کے لیے موت ہوگی۔
(ضمیمہ نزول المسیح ج 19 ص:148)

مرزا کی یہ کتاب 15 نومبر 1902ء کو شائع ہوئی۔ ادھر مرزا غلام احمد اپنی فتح کے گن گا رہا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ مولانا ثناء اللہ صاحب قادیان پہنچے تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ مرزا نے اپنی کتاب (مواہب الرحمٰن ص:113، ر،خ،ج19،ص 329) میں تسلیم کیا کہ مولانا ثناء اللہ صاحب اس سلسلے میں قادیان آئے۔ مرزا نے جب اپنی کشتی ڈوبتی دیکھی تو اس نے مولانا کے بارے میں مسلمانوں کو اشتعال دلانے کی کوشش کی اور مولانا پر الزام لگایا کہ انہوں نے صحابی رسول ﷺ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی توہین کی ہے۔ مرزا غلام احمد نے مولانا پر یہ الزام اس لیے لگایا کہ لوگ ان

کے خلاف ہو جائیں گے' حالانکہ اس نے خود سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر سخت جراح کی، جب اس کا یہ وار بھی خالی گیا تو اس نے مولانا کے ساتھ فیصلہ کن معرکہ برپا کرنے کا اعلان کیا، تو اس نے مولانا صاحب کو خط میں لکھا کہ آپ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں' حالانکہ میں سچا نبی ہوں میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھ میں اور ثناء اللہ میں سچا فیصلہ فرما اور جو تیرے نزدیک جھوٹا ہے اس کو سچے کی زندگی میں دنیا سے اٹھا لے یا کسی سخت آفت میں جو موت کے برابر ہو مبتلا کر دے۔ (مجموعہ اشتہارات جلد3 ص:578)

مرزا کے اس اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جھوٹ اور سچ کا مداوا دو باتوں پر رکھا:

① ۔ مرزا غلام احمد اور مولانا ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ میں سے جو شخص پہلے فوت ہوگا وہ جھوٹا ہوگا۔

② ۔ ان دونوں میں جسے بھی موت آئے وہ کسی مہلک بیماری جیسے طاعون ہیضہ سے ہوگی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ نے کیا فیصلہ کیا' کسے پہلی موت آئی؟ کس طرح موت آئی؟ جب ہم دونوں کی تاریخ وفات پر نظر ڈالتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ مرزا غلام احمد کی تاریخ وفات 26 مئی 1908ء ہے۔ یعنی اپنی دعا کے تقریباً 13 مہینے اور 11 دن میں مرا جبکہ مولانا ثناء اللہ اس دعا کے تقریباً

چالیس سال بعد 1948 میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ مولانا ثناء اللہ طاعون ہیضہ جیسی کسی بیماری میں مبتلا نہ ہوئے اور نہ آپ نے ایسی بیماری میں وفات پائی' البتہ مرزا کو منہ مانگی بیماری ضرور ملی۔

# جان دینا منظور ہے لیکن......

خلیفہ معتصم باللہ جب قرآن مجید کو مخلوق کہنے کے سلسلے میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا موقف بدلنے سے عاجز آ گیا تو اس نے ان پر مزید سختی شروع کر دی، سزا دینے کے لیے ظالم اور جابر جلاد مقرر کیے اور بے پناہ تشدد کرایا۔ جلاد کے سخت مار پیٹ کی وجہ سے امام صاحب کا کندھا اکھڑ گیا۔ پیٹھ سے خون کے فوارے جاری ہو گئے۔ خلیفہ معتصم آگے بڑھا اور بولا: ''احمد! صرف یہ کہہ دو کہ قرآن اللہ کی مخلوق ہے، میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول کر تمہیں آزاد کر دوں گا اور تمہیں دنیا جہاں کی نعمتوں سے مالا مال کر دوں گا'' لیکن امام صاحب نے اس کی ایک نہ سنی اور جواب میں صرف یہ فرمایا: ''قرآن کی کوئی آیت یا حدیث کی کوئی نص اس کی دلیل کے طور پر پیش کر دو، میں فوراً اپنی رائے تبدیل کر لوں گا۔ خلیفہ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا اور دانت پیستے ہوئے جلاد سے کہا: ''یہ میری بات نہیں مان رہا، تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں، تم نے سختی نہ کی اور زیادہ قوت

سے مارو۔ جلاد نے پوری قوت سے کوڑے مارنا شروع کر دیے۔ امام صاحب کوڑوں کی تاب نہ لا سکے اور ان کا گوشت پھٹ گیا اور جسم سے خون کا فوارہ نکل پڑا۔ خلیفہ کا ایک درباری عالم آگے بڑھا اور کہا: احمد بن حنبل!

" کیا اللہ تعالیٰ نہیں فرماتا کہ اپنی جانوں کو قتل نہ کرو۔" (النساء:29)

پھر کیوں خواہ مخواہ اپنی جان کے درپے ہو اور خلیفہ کی بات نہ مان کر اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہو؟ امام احمد نے فرمایا: " باہر نکلو اور دروازے سے باہر دیکھو تمہیں کیا نظر آتا ہے؟ اس نے محل کے صحن سے نکل کر جھانک کر دیکھا کہ بے شمار لوگ ہاتھ میں کاغذ قلم لیے انتظار کر رہے ہیں، درباری عالم نے اس مجمع سے پوچھا: کس چیز کے منتظر ہو؟ لوگوں نے کہا: " ہم خلق قرآن کے مسئلے میں امام احمد کے منتظر ہیں تاکہ اس کو لکھ سکیں۔" وہ درباری عالم واپس آیا اور امام احمد کو خبر دی تو امام صاحب نے فرمایا: کیا میں ان تمام لوگوں کو گمراہ کر دوں؟ جو ہاتھ میں کاغذ اور قلم لیے میرے جواب کے منتظر ہیں؟ اللہ کی قسم! اپنے آپ کو قتل کروانا منظور ہے مگر ان کو گمراہ کرنا منظور نہیں' امام احمد پر اللہ کروڑوں رحمتیں ہوں۔

# صحرا میں موت

سورج قہر کی آگ برسا رہا تھا اور سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اگرچہ اس کی اونٹنی تازہ دم تھی لیکن تپتے سورج کی تیز دھوپ کی وجہ سے گرم ریت پر چلنے میں اسے دشواری کا سامنا تھا۔ دھوپ آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی اور صحرا جہنم زار بنتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو ہمت کر کے سفر کرتا رہا۔ بالآخر سخت گرمی کا مقابلہ کرنا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔ اونٹنی پر چھاگل میں پانی اور توشہ دان میں ہفتوں کی خوراک بھی محفوظ تھی لیکن وہ تھک چکا تھا، پسینے سے شرابور' تھکن سے چور تھا' اس کا جسم اب جواب دیتا جا رہا تھا' دھوپ کی تمازت اور جھلستے ہوئے صحرا میں مزید سفر اس کے لیے دشوار تھا۔ اس نے ریت کے ایک بلند ٹیلے پر اونٹنی روکی اور سایہ تلاش کرنے لگا کہ اچانک ایک طرف چند درخت دکھائی دیے' ماتھے پر ہاتھ رکھا اور دو تین بار آنکھیں جھپک کر غور سے دیکھنے لگا......

وہ واقعی درخت تھے، اس کے تھکے ہوئے چہرے پر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ گرمی سے جھلسی ہوئی سرخ آنکھوں میں روشنی پھیل گئی۔ سوار نے مہار کھینچی اور اونٹنی کا رخ درختوں کی طرف موڑ دیا' بڑھتی ہوئی تیز دھوپ اور گرمی نے اسے سائے کی تلاش پر مجبور کر دیا تھا اور خوش قسمتی کہ سائے کی تلاش میں بھی اسے زیادہ دقت نہ اٹھانی پڑی۔ درختوں کی طرف جاتے ہوئے اس نے سوچا کہ کچھ دیر سائے میں آرام کروں گا اور پھر گرمی کے ختم ہونے اور دھوپ کی تمازت کے اختتام پر آگے کا سفر کر لوں گا۔ درختوں کے پاس پہنچتے ہی وہ جلدی سے اونٹنی سے اترا اور ایک درخت کے نیچے ڈیرہ جما لیا۔ تپتے صحرا میں ٹھنڈی چھاؤں کے ملتے ہی وہ بھول گیا کہ اس کا سامان ابھی اونٹنی پر ہی ہے۔ وہ سفر سے تھکا تھا، سائے میں بیٹھتے ہی اسے نیند آنے لگی۔ اس نے ایک درخت کے تنے کے ساتھ سر ٹکایا اور وہیں لیٹ گیا' لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔ وہ دیر تک پڑا سوتا رہا جب نیند ہی کی حالت میں اسے پیاس نے سخت ستایا' اور پھر پیاس کی شدت بڑھی تو اس نے بے چینی سے آنکھیں کھول دیں۔ اسے سخت پیاس لگی تھی' اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے' وہ اٹھتے ہی جلدی سے اونٹنی

کی طرف بڑھا۔ اونٹنی پر پڑی چھاگل میں پانی موجود تھا...... اچانک اس کے اٹھتے ہوئے پاؤں رک گئے۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ لٹی پھوٹی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ درحقیقت اس کی اونٹنی غائب تھی۔ وہ حیران و پریشان اس جگہ کو دیکھنے لگا جہاں اس نے اونٹنی کو کھڑا کیا تھا' لیکن اب اونٹنی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس کا تمام زادِراہ اونٹنی پر تھا۔ خوراک' پانی کی چھاگل...... چھاگل کا خیال آتے ہی اس کی پیاس اور بڑھ گئی جو اونٹنی کے گم ہونے کی وجہ سے ذرا محسوس ہو رہی تھی۔ پیاس کی بڑھتی ہوئی شدت سے اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔

وہ درختوں کے چاروں طرف دور دور تک گیا، ریت کے ٹیلوں پر کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن اونٹنی نہ ملی۔ اونٹنی کی تلاش میں ہونے والی تگ و دو سے اب اس کی پیاس اور بڑھ گئی، وہ دیوانہ وار اونٹنی کو آوازیں دینے لگا...... پانی صحرا میں تھا نہیں' ایک واحد سہارا اونٹنی تھی لیکن وہ تو اب غائب تھی۔...... اس کے اوسان خطا ہونے لگے' اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے وہ چند لمحوں کا مہمان ہے۔...... یا اللہ میں کیا کروں؟ وہ بے خیالی میں بولا!

بے آب وگیاہ صحرا میں اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پیاس کی شدت نے اس سے سوچنے سمجھنے کی حس بھی ختم کر دی تھی۔ جسم تھا کہ اس کا اٹھانا مشکل تھا، اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا، اسے اپنی موت نظروں کے سامنے گھومتی نظر آئی...... اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کہ ہاتھ پاؤں سے جان نکل رہی ہے۔ آنکھیں بند تھیں اوراضطراری حالت تھی کہ اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی، نظر آتی موت نے اس کے کانوں کی سماعت اور تیز کر دی تھی...... وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو دیکھا کہ سامنے اس کی اونٹنی کھڑی ہے، اس نے آنکھیں جھپکیں اور غور سے دیکھنے لگا جیسے اس کو یقین نہ آ رہا ہو۔ وہ واقعی اس کی اپنی اونٹنی تھی، اس پر چھاگل بھی تھی اور توشہ دان بھی، اس نے پھر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملیں اور بے قراری میں بولا: ”یا اللہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا“...... لیکن وہ خواب نہیں تھا بلکہ حقیقت تھی جسے وہ جھٹلا نہ سکتا تھا۔ اس نے موت کو اپنے سامنے دیکھا تھا اور اب اونٹنی اس کے سرہانے کھڑی تھی لیکن اب بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ مسافر کے خشک حلق، سوکھے ہونٹ، پیاس کی شدت اور جسم کی نقاہت کی وجہ سے بے کراں طبیعت میں یک دم تازگی آ گئی' آنکھوں دیکھی موت

سے چھٹکارا ملا تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔

موت کی تاریک وادی سے زندگی کے جگمگاتے اجالے میں آنے سے اسے یہ بھی پتا نہ چلا کہ اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے، وہ خوشی سے سرشار ہو گیا اور بولا: ''اے میرے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب۔'' حالانکہ اسے کہنا تھا کہ ''اے میرے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں اور تو میرا رب۔'' پیارے بچو! ہمارے پیارے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''اونٹنی کے مل جانے پر ایسے سوار کو جتنی خوشی و مسرت ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ خوشی اللہ تبارک و تعالیٰ کو تب ہوتی ہے جب کوئی گناہ گار بندہ اللہ کے حضور توبہ کرتا ہے۔'' (ماخوذ: صحیح مسلم شریف، کتاب التوحید)